© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نظرات

۱۰ اور ۱۱ جون کو سپرو ہاؤس نئی دہلی میں انڈین مسلم کنونشن بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ منعقد ہوا۔ آزادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جبکہ مسلمانوں کے مختلف طبقات اور جماعتوں کے چھ سو سے زیادہ ممتاز اور نمائندہ افراد نے یک زبان و یک لہجہ ہوکر پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ان ناانصافیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے جو وہ گذشتہ چودہ برس سے برابر دیکھتے اور بھگتتے چلے آرہے ہیں۔ یہ اجتماعی آواز تجویزوں اور ریزولیوشنوں اور اخباری مضامین و مقالات کی صورت میں وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف گوشوں سے پہلے بھی بلند ہوتی رہی ہے لیکن انفرادی اور پست ہونے کے باعث اُس کا حال یہ تھا کہ کسی نے سُنی اور کسی نے نہ سُنی لیکن کنونشن کی آواز، آواز نہیں بلکہ صورِ اسرافیل تھی جس نے ملک کے بام و در میں زلزلہ کی سی کیفیت پیدا کردی اور جس کی گونج بیرونی ممالک کی فضاؤں میں بھی بیساختہ سنی گئی

ملک کے جمہوری اور سیکولر نظامِ زندگی کی سنگین دیواروں میں جگہ جگہ سے رخنے پڑنے لگے تھے، جارحانہ فرقہ پرستی کے سیلاب نے اِن رخنوں کو وسیع کرکے ملک کی سالمیت اور اس کے استحکام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع کردیا تھا۔ کہنے والوں نے کہا اور اس خطرہ سے آگاہ کیا لیکن جب اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو ان سب نے سپرو ہاؤس میں جمع ہوکر ایک متحدہ اور پُرزور آواز بلند کی، جو لوگ پہلے سے بیدار تھے اور جن کے دلوں میں انصاف اور ملک و وطن سے محبّت کا صحیح جذبہ تھا انھوں نے اس آواز کی قدر کی اور چیخنے والوں کو ملک کا اور انسانیت کا حقیقی خیرخواہ اور دوست یقین کیا لیکن وہ جو تعصب اور تنگ نظری کی گہری نیند کے ماتے اور بادۂ شبانہ غفلت میں سرشار تھے اور اسی کیف و سرمستی میں مدہوش و بے خبر رہنا چاہتے تھے۔ اس آواز سے اُن کی نیند اُچاٹ ہوئی تو غصہ میں تلملا اُٹھے اور واجد علی شاہ کے عہد کے روایتی احدیوں کی طرح اول فول بکنا شروع کردیا۔ بہرحال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کنونشن کا نتیجہ بھی ہوتا تھا۔ وہ اس اعتبار سے بہمہ وجوہ کامیاب ہی کہ جس آواز کو بہت کم سنا جاتا تھا آج اُس کی بازگشت ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی ہی اور تمام سنجیدہ فکر وانصاف پسند باشندگانِ ملک نے سوچنا شروع کردیا ہی

جب سے کنونشن ہوا ہی فرقہ پرست اخبارات اور ادارے مسلمانوں کے خلاف برابر زہر افشانی کررہے اور جلی کٹی باتیں سنا رہے ہیں لیکن اصل یہ ہی کہ مسلمانوں کا یہ کنونشن کرنا اور اس بے جگری اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے اندرونی محسوسات اور شکایات کو بے پردہ ظاہر کرنا نفسیاتی طور پر خود اس بات کی کھلی دلیل ہی کہ مسلمان اس ملک کو اپنا ملک اور یہاں کی قومی حکومت کو خود اپنی حکومت اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح کہ دوسرے لوگ سمجھتے ہیں. ایک اقلیت اپنی شکایات کے اظہار میں اس درجہ بے باک اُسی وقت ہوسکتی ہی جبکہ اُس کے لاشعور میں ملک کے ساتھ اُس کے تعلق کا تصوّر اتنا ہی پختہ ہو جتنا کہ اکثریت میں ہوتا ہے۔ اس بنا پر اقلیت میں خود اعتمادی کے اس جذبہ کا پیدا ہونا جمہوریت کے لئے ایک نیک شگون اور اچھّی فال ہی جس پر جمہوریت پسند حضرات کو بجائے بگڑنے اور خفا ہونے کے خوش ہونا چاہیئے۔

رہا شکایات اور مطالبوں کا معاملہ تو اس پر زیادہ بحث تمحیص اور ردّ وکد کی ضرورت نہیں ہی حکومت کے دفتروں اور اخبارات کے فائلوں میں ہر چیز کے اعداد و شمار موجود ہیں اُن کی روشنی میں سنجیدگی کے ساتھ گفتگو ہوسکتی ہی کہ ان مطالبات میں کتنی چیزیں درست ہیں اور کتنی غلط؟ اور جو درست ہیں اُن میں کوئی مبالغہ ہی یا نہیں؟ اگر ہی تو کس حد تک؟ بہرحال فرقہ پرست جو کچھ کررہے ہیں اس حرکت سے وہ خود اپنے آپ کو دنیا اور جمہوریت پسندوں کی نظر میں رسوا کررہے ہیں کنونشن والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ انکی آواز حق کی آواز ہی اور وہ اُن کی ژاژخائیوں سے دب نہیں سکتی۔

اس سلسلہ میں ہم کو مسلمانوں سے بھی یہ کہنا ہی کہ محض کنونشن یا حکومت سے اپنے چند مطالبات منوالینا اُن کی زبوں حالی کا اصل علاج ہرگز نہیں ہی کوئی قوم محض مدعا طلبی یا حکومت کے سہارے سے نہ زندہ رہ سکتی ہی اور نہ ترقی کرسکتی ہے جب تک کہ خود اُس میں ہمہ جہتی تعمیر و ترقی کا جذبہ اور ولولہ نہ ہو۔ افسوس ہی کہ یہ جذبہ نہ عوام میں ہی اور نہ خواص میں یہانتک کہ ہمارے لیڈروں کا ذہن بھی اس کے پلان اور منصوبہ سے خالی ہی۔ اس کام کے لئے پتّہ مار کر ٹھنڈے دل و دماغ سے یکسوئی اور خلوص کے ساتھ جو کام کرنے کی ضرورت ہی اُس کا سلیقہ اس وقت نہ کسی فرد میں نظر آتا ہی اور نہ کسی جماعت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند جزوی مسائل ہیں جن سے خاص خاص لوگوں یا بعض اداروں کو ذاتی یا رسمی طور پر دلچسپی ہے اور بس وہ اسی ایک لکیر کو پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک قوم کا عروج و زوال گویا انہیں دو ایک باتوں کے ہونے نہ ہونے پر موقوف ہے۔ پھر ایک سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ملکی اور وطنی زندگی میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اندازِ فکر اور اُن کا طرزِ عمل یا دفاعی ہے اور یا منفی۔ ایجابی اور اقدامی ہرگز نہیں ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کو اُن کی آبادی کے تناسب کے مطابق حصہ نہیں مل رہا ہے جس کی وجہ سے اُن کی اقتصادی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شکایت سرتاسر بجا اور درست ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے نونہالانِ قوم کے تعلیمی معیار کو اونچا کرنے کے لئے کیا کیا؟ اُن کے قومی اداروں کا کیا حال ہے؟ اسلامیہ کالجوں کی حالت ہر اعتبار سے کس درجہ سقیم ہے؟ انھوں نے اقتصادی زبوں حالی دور کرنے کے لئے کتنے کارخانے کھولے؟ کتنے ٹیکنیکل کالج قائم کئے؟ مسلمانوں کے ہر جلسہ میں اُردو کے متعلق ایک ریزولیوشن منظور ہو جاتا ہے۔ مگر خود اُن کا اُردو اخبارات اور اُردو کی کتابوں اور اُن کے مصنفوں کے ساتھ کیا رویّہ ہے؟ انہیں شکوہ ہے اور بالکل بجا ہے کہ اسکولوں میں نصاب کی بعض کتابیں پڑھ کر اُن کے بچے گمراہ ہو جائیں گے۔ مگر انھوں نے اس کا کیا بندوبست کیا ہے کہ اُن کے بچّے اور بچیاں خود اُن کی غیر مذہبی اور غیر اخلاقی زندگی سے گمراہ نہ ہونگے۔ اُنہیں سوچنا چاہیئے کہ خود اُن کے گھروں کا کیا ماحول ہے؟ اور اس ماحول میں احکامِ شریعت کا احترام کتنا ملحوظ رکھا جاتا اور دن رات میں کَے بار اللہ اور اُس کے رسول کا نام زبانوں پر آتا ہے؟ ہم کو اکثریت سے شکایت ہے کہ اُس کا برتاؤ ہمارے ساتھ فراخدلی کا نہیں ہے۔ لیکن خود ہمارے معاملات اپنے بھائیوں۔ عزیزوں اور ہم جنسوں کے ساتھ کس قسم کے ہیں؟ ہم میں کتنے فیاض ہیں اور کتنے خود غرض؟ فطرت کا قانون یہ ہے کہ قومیں احتسابِ نفس اور اُس کے مطابق عملی جدّ و جہد سے ترقی کرتی ہیں۔ ظلم پر احتجاج اور اپنے حقوق کا مطالبہ، یہ دونوں بھی ضروری ہیں۔ لیکن یہ مفید اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ ان کے ساتھ تکمیلِ حیات کا جذبہ و ولولہ اور عملی جدّ و جہد بھی ہو۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔

برہان میں پچھلے دنوں غمگین دہلوی پر جو مضمون شائع ہوا ہے اس سلسلہ میں قاضی عبدالودود صاحب ایک والا نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میرا یہ خیال نہ کبھی تھا اور نہ اب ہے کہ غمگین رنگین کے شاگرد نہ تھے۔ برہان میں جو میرا خط چھپا تھا اس میں اس کے خلاف درج ہے تو یہ طباعت کی غلطی ہے یا میرا سہوِ قلم۔

© rasailojaraid.com